ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
Vol. 2, No.3 (2020)
(July to September)

مجید امجد کی نظموں میں ہست و نیست کا تصور
(منتخب نظموں کا تجزیہ)

The concept of "Hust-o-Nabood majeed amjad's poems (Analysis of selected poems)

کرن اسلم
پی ایچ۔ڈی اُردو اسکالر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract:

Majeed Amjad is one of the most famous poets who gave a new twist to poetry in Urdu modern poetry. Majeed Amjad experimented with new forms and themes in his poetry. He has shown different aspects of life in his poems. For him, the idea of death goes hand in hand with life. He finds metaphors of life and death in his daily observations. Oriental traditions, metaphors related to home are often seen in his Poetry. Majeed Amjad also used Hindi words frequently. Majeed Amjad is primarily a poet of poetry. His poetry shows an element of modernity, feeling of loneliness and wonder. Majeed Amjad experimented with all dimensions in poetry. "Shab Gradually" is a testimony to the fact that he experimented with the new nature of poetry and the new language of poetry. These experiences gave new freshness and growth to his poetry. The last few years of Majeed Amjad's life were full of creative considerations. In the last period, he wanted to reach his reader's heart and mind in an untouched manner in such a way that he began to feel the prevailing qualities incomplete.

Key Words: Majeed Amjad, experimented, Modern Poetry, metaphors, forms, topics, Concept of Life and Death, Metaphors, Hindi words

اُردو ادب میں جب جدید شاعری کا آغاز ہوا تو اس نے محض سیاسی بیداری اور سماجی ذمہ داری کا احساس ہی پیدا نہیں کیا بلکہ تجربے کے جوش، جذبے، خیال کی ندرت اور اس پر اعتبار کرنا بھی سکھایا۔ شعرا کی نئی نسل میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ جن میں غزل سے بیزار نہیں تو کم مطمئن ضرور تھے۔ نظم نگاروں میں دو گروہ سامنے آئے تھے، ایک گروہ اُن شعرا کا تھا جنھوں نے سماجی ذمہ داری اور سیاسی بیداری کے حوالے سے بات کی۔ دوسرا گروہ اُن کا تھا جنھوں نے لاشعور، جنس، انفرادی گھٹن، احساسِ تنہائی اور نفسیاتی مسائل شاعری کا حصّہ بنایا۔ دونوں گروہوں کے شعرا نے اپنے اپنے طور پر شاعری کی سرحدوں میں توسیع کی اور اس کی تابناکی میں اضافہ بھی کیا۔ جدید نظم نگاری میں جن شعرا نے شاعری کو ایک نیا موڑ دیا ان میں فیض احمد فیض، میرا جی، ن۔م راشد، مجید امجد، وزیر آغا، منیر نیازی، اختر الایمان، فتخار جالب وغیرہ شامل ہیں۔

ن۔م راشد اور میراجی کی شعری روایت میں شعری ہیئت کی ایجاد ایک منصب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی شعری روایت میں مجید امجد کا نام اس لیے اہم ہے کہ ان کے ہاں ہیئت موضوع اور مواد کے تابع ہے۔ اُردو ادب میں آزاد نظم کا تجربہ پابند شاعری کی متعینہ ہندستانی حدود سے باہر آنے کا تجربہ تھا۔[۱] مجید امجد کی آزاد نظم کے حوالے سے امجد اسلام امجد لکھتے ہیں:

"نئی نظم اور آزاد نظم کے سلسلے میں کچھ سکّہ بند نام بار بار دہرائے جاتے ہیں لیکن میرے نزدیک ان سب سے زیادہ اہم اور اور دور رس اثرات کا حامل کام مجید امجد نے کیا ہے۔ اُن کی شاعری کے موضوعات، تکنیک، نظم کی فکری اور فنّی ترتیب، نئے اسالیب کی طرف بے جھجک پیش قدمی اور سب سے بڑھ کر زندگی بھر ایک نئے لہجے کی تلاش کا وہ عمل بنیادیں ہیں جن پر مستقبل کی شاعری کو اپنے کاخ و کو بلند کرنے ہیں۔"(۲)

مجید امجد بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں جدیدیت، احساسِ تنہائی اور حیرت کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔ مجید امجد نے شاعری میں ہر جہت کے تجربے کیے۔ "شبِ رفتہ" اس بات کا شاہد ہے کہ انھوں نے نظم کی نئی ہیئت اور شاعری کی نئی زبان کے تجربے کیے۔ انھی تجربات نے ان کی شاعری کو نئی تازگی اور نمو بخشی۔ مجید امجد کی زندگی کے آخری چند برس تخلیقی لحاظ سے بھرپور تھے۔ آخری دور میں وہ اچھوتے انداز میں اپنے قاری کے دل و دماغ تک اس طور رسائی چاہتے تھے کہ انھیں مروجہ ہیئتیں ادھوری محسوس ہونے لگیں۔ بقول احمد ندیم قاسمی "اگر اسے چند برس اور مل جاتے تو وہ یقیناً نظم کو ایک قطعی نئی ہیئت سے سرفراز کر جاتا۔"[۳] مجید امجد کو حیرت کا شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ حیرت تمام فنون کی بنیاد ہے۔ حیرت کے سفر کی کوئی آخری منزل نہیں ہوا کرتی۔

ملے نہ ہوا تو ویرانۂ حیرت　　؎

حیرت کے سفر میں صرف جستجو اور کھوج کا جذبہ انسان کو زندہ رکھتا ہے۔ حیرت زندگی کے سفر کو آگے بڑھاتی ہے۔ ان کی نظموں میں زندگی کا شعور مختلف رنگوں میں نظر آتا ہے۔ زندگی کے مختلف صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔

کسی سڑتے ہوئے جوہڑ کے اندر
پڑا ایک رینگتے کیڑے کو پینا
مگر مقصد وہی دو سانس جینا
چمکتی کار فراٹے سے گزری
غبارِ راہ نے کروٹ بدلی، جاگا
اُٹھا، اک دو قدم ساتھ بھاگا

پیاپے ٹھوکروں کا یہ تسلسل

یہی پرواز بھی، اُفتادگی بھی

متاعِ زیست اس کی بھی، مری بھی　　(طلوعِ فرض)

مجید امجد کی نظموں میں نظر آنے والے زندگی کے شعور میں صرف ہست کا نہیں نیست کا پہلو بھی شامل ہے؛ جو زیست کا نقیض بن کر آتا ہے۔ نظم "کنواں" بن کر آتا ہے۔ نظم "کنواں" میں بھی وجود اور عدم وجود کا چکر موجود ہے۔

عدم سے ازل تک، ازل سے ابد تک، بدلتی نہیں ایک آن اس کی گردش

نہ جانے لیے اپنے دولاب کی آستینوں میں کتنے جہان اس کی گردش

رواں ہے، رواں ہے

تپاں ہے ، تپاں ہے

یہ چکر یونہی جاوداں چل رہا ہے

کنواں چل رہا ہے

نظموں کا تجزیہ

نظم "نیلے تالاب" میں ہست و نیست کے پہلو:

سب اس گھاٹ پہ اک جیسے ہیں

جب سے نیل گگن کی ٹہنکی سے پانی برسا ہے

جب سے سات سمندر، سات بھرے ہوئے ٹب پانی کے

اس آنگن میں رکھے ہیں

پہلے بھی سب لوگ اس گھاٹ پہ اک جیسے تھے

اور۔۔۔ اب بھی اس کالے نل میں جب سے

کھٹ سے، کھچ کر آنے والا پانی

چھک سے گرنے لگا ہے

چکنی اینٹوں والے گھاٹ پہ، سارے خدا اور سارے فرشتے اور سب روحیں

اپنے غرور کی اس پھسلن میں اک جیسی ہیں،

مجید امجد کا وژن نفسِ انسانی اور اس کائنات کے متعلق گہرا اور حکیمانہ دکھائی دیتا ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات کے لیے جس طرح انھوں نے ایک گھر کی تمثال وضع کی ہے وہ ان کے نزدیک زندگی میں گھر کی اہمیت اور قدر و قیمت کی وضاحت کرتی ہے۔ اسی مناسبت سے تلازمات کا استعمال کیا گیا ہے۔ ٹینکی، ٹب، آنگن، نل، اینٹیں، ہر گھر کا حصّہ ہیں۔ اس تمثال میں شاعر نے ایک سے زیادہ باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ "گھر" اپنے وجود میں ایک پوری کائنات ہوتا ہے۔ دنیاوی زندگی کی اکائی اور ہر فرد کی کل کائنات۔ گھر ہی انسان کی زندگی کا محور و مرکز ہے، یعنی اس چھوٹی سی کائنات میں ایک وسیع کائنات پوشیدہ ہے۔

پانی، دنیاوی حیات کا سب سے اہم جزو ہے۔ پانی کو زندگی کہا جاتا ہے۔ جب سے نیل گگن سے پانی برسا ہے۔ یعنی بارش کے برسنے پر زندگی کا انحصار ہے۔ دنیا میں بہت سے علاقے آج بھی ایسے ہیں جہاں صرف بارش کے پانی پر ہی زندگی کا دار و مدار ہے۔ جب سے اس کائنات کا آغاز ہوا ہے، یعنی جب آسمان کی ٹینکی سے پانی برسا، ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ تب سے ہی انسان سبھی اک جیسے ہیں۔ سات سمندروں کو پانی کے سات ٹب کہہ دیا ہے۔ پانی کی کمی کے خیال سے بعض اوقات گھروں میں پانی محفوظ کرنے کے لیے ٹب وغیرہ بھر کے رکھ لیے جاتے ہیں۔

جب سے گھر (دنیا) کے آنگن میں سات ٹب پانی بھر رکھا ہے، تب سے، ازل سے سب یہاں بسنے والے، اک جیسے ہیں۔ بحیثیت انسان کوئی کسی سے کم تر نہیں اور نہ ہی کوئی برتر ہے۔ گھاٹ سے مراد یہاں انجام کا گھاٹ کہا جا سکتا ہے۔ پہلے بھی ایک جیسے تھے سب اور اب، جب کہ انسان نے خود کو دوسروں سے ممتاز کرنے کے لیے نئی نئی چیزیں ایجاد کر لی ہیں۔ کالے نل بنا لیے ہیں۔ یہ سمجھ کر کہ اب وہ پانی کے لیے بھی خود مختار ہے۔ ٹیوب ویل کی مدد سے کھینچ کر آنے والا پانی جب اس نل سے چھک کی آواز سے گرنے لگا ہے۔ یعنی انسان نے اپنی الگ دنیا بنالی ہے۔ لیکن اس کی وہ تقدیر جو ازل سے لکھ دی گئی ہے، پھر بھی بدل نہیں سکتی۔ گھاٹ پر مسلسل پانی نے چکناہٹ پیدا کر دی ہے۔ چکنی اینٹوں والا گھاٹ ہے۔ یہاں آ کر دنیا کے سب خدا، سارے فرشتے، فرشتوں جیسی معصومیت کے دعوے دار یا حقیقتاً معصوم اور نیک و بد سب روحیں، یعنی سب انسان پھسل کر گر جاتے ہیں۔ غرور کی پھسلن ان کا توازن برقرار نہیں رکھ پاتی۔ یہی ہے وہ گھاٹ جہاں سب امتیازات مٹ جاتے ہیں کیوں کہ انجام سب کا ایک جیسا ہے۔

اے رے شہر ابد کے واٹر ورکس کے رکھیا!

دلوں کی صدرُخ نلکی میں اپنی سطحیں ہموار نہ رکھ سکنے والے سب پانی،

سارے مقدس پانی

کس طرح نیلے تالابوں میں آ کر یک سُو ہو جاتے ہیں　　(۴۲۔۸۔۸۶۹۱)

نظم کے آخر میں شاعر نے اس بسیط کائنات کے لیے واٹر ورکس کا تلازمہ استعمال کر کے ایک نئی مثال دی ہے اور خالقِ کائنات کو اس کارکھوالا بتایا ہے۔ انسان کے دل کی ساخت اور اس میں نسوں کے جال کے لیے "صدرُخ نلکی" کی ترکیب کا خوب استعمال کیے۔ جس میں بہنے والے پانی اپنی سطح ہموار نہیں رکھ پاتے۔ سب مقدس پانی، جب نیلے تالابوں میں گر جاتے ہیں تو یک سُو ہو جاتے ہیں۔ نیلا تالاب فنا کا استعارہ ہے۔

اس نظم میں مجید امجد نے پانی اور اس کی ترسیل کے ذرائع سے متعلق تلازمات کا سلسلہ پیش کیا ہے۔ انسان کی ذات اس کائنات میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ ذات، حکمت و دانائی چاہتی ہے۔ عاجزی و انکساری پر مائل رہتی ہے۔ ذات ہی نفسِ انسانی کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ جب کہ انا انسان کو دوسروں سے برتر ثابت کرنے لیے کوشاں رہتی ہے۔ ذات، انسانی امتیازات کا خاتمہ چاہتی ہے۔ مجید امجد کی یہ نظم ایک دائرے میں سفر کرتی ہے۔ ازل سے شروع ہونے والی ہست سے ابد کے نیست تک۔ سب اس گھاٹ پہ اک جیسے ہیں۔ موضوع اور تکنیک دونوں سطح پر ایک دائرہ ہے۔ ذات کا دائرہ۔ ذات کے اندر اور باہر کے سفر کا دائرہ۔ جہاں سے آغازِ سفر ہے وہیں انجامِ سفر۔

"نیلے تالاب" میں مجید امجد نے ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے، مثلاً: گھاٹ، گگن، آنگن، کھٹ، وغیرہ۔ مجید امجد کے حسّی تجربات بھی اس نظم میں سامنے آتے ہیں۔ اس نظم کو تمثال کاری اور استعارہ سازی کے ذریعے، صرف پڑھا ہی نہیں دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ نظم میں سمعی سے زیادہ بصری حس کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس تمثال کاری کے پیش منظر میں کائنات سے متعلق ذات کی حکیمانہ نظر بھی دکھائی دیتی ہے۔

مجید امجد کی نظم "چولھا" میں ہست و نیست کا رنگ روپ ملاحظہ کیجیے:

ڈوریاں جب سے تھرائی ہیں

زیست کی نیم باز پلکوں کی

آگ جلتی ہے تیرے سینے میں

روشنی جھونپڑوں، محلکوں کی

آگ جلتی ہے، زندگی کی آگ!

جس کی لپٹوں پہ ہاتھ سینکتے ہیں

آنسوؤں کی نمی سے ٹھٹھرے راگ!

جس کے زخمی دھوئیں چھپ چھپ کر

روح سے روح بات کرتی ہے

دل کے داغوں کی سطحِ سوزاں پر

قہقہوں کی برات اُترتی ہے

اس نظم کا عنوان "چولھا"؛ اپنے اندر معنی کی ایک دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔ مشرقی تہذیب میں باورچی خانہ اور چولھا گھر کا مرکز ہے۔ زندگی جینے کا سامان ہے۔ چولھے میں جلتی آگ، جس کے گرد گھر کے افراد سرد موسم میں خود کو حرارت پہنچاتے ہیں، گھر کے افراد کو یکجا رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جلتا ہوا چولھا؛ زندگی کا استعارہ ہے اور چولھے کا ٹھنڈا ہونا، موت کا استعارہ ہے۔ نظم کے پسِ منظر میں خاموشی کی فضا کا احساس موجود ہے۔

زندگی کی نیم باز پلکوں میں جب سے ذرا سی تھراہٹ ہے، یعنی جب سے زندگی کا آغاز ہے، سینے میں آگ جلتی ہے اور جذبوں کی حرارت ہے۔ جھونپڑی ہو یا محل سب جگہ جذبے ایک سے ہیں۔ زندگی کی آگ ہر جا ایک سی ہے اور روشنی آگ کے ساتھ مشروط ہے۔ زندگی ہے تو روشنی ہے۔ جس کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر ہاتھ سینکتے ہیں، وہ ٹھٹھرتے ہوئے راگ جو آنسوؤں کی نمی کی ٹھنڈک سے کپکپا رہے ہیں۔ اس آگ کا دھواں غموں اور دکھوں سے زخمی ہے۔ اس زخمی دھوئیں کی آڑ میں روحیں ایک دوسرے سے بات کرتی ہیں۔ دل پر لگے ہوئے داغ، زخموں کے نشان جل رہے ہیں۔ اور ان جلتے ہوئے داغوں پر قہقہوں کی برات اُترتی ہے۔ یعنی داغ کھلے ہوئے ہیں۔ جن پر قہقہوں کا گمان گزرتا ہے۔ درد جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو تکلیف کی شدت میں قہقہے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

تو نے دیکھیں وہ ان گنت شامیں

جب ترے آہ بر لب انگارے

ہو گئے بجھ کے سرد راکھ کا ڈھیر

چھڑ گئے دو دلوں کے اکتارے

پہلے آگ جلنے کی بات کی گئی ہے اور اب بجھنے کی۔ آگ سے انگارہ دہک چکا ہے۔ زندگی میں ایسی شامیں بھی آئیں کہ جب آہ بر لب انگارے بجھ کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ رنج و غم کی شدت اس قدر بڑھی کہ آخر درد کے انگارے بجھے اور دو دلوں کے تار چھڑ گئے۔ دلوں کا ربط قائم ہوا۔ زندگی دھڑک اُٹھی۔

دو نگائیں اُٹھیں، ملیں، چمکیں

آنے والی سحر کی دھندلی آس

دو نگائیں اُٹھیں، ملیں، چمکیں

آنے والی سحر کی دھندلی آس

دو تڑپتے دلوں میں تیر گئی

زندگی کی دھڑکن نے نگاہوں میں چمک بھر دی۔ آنے والی نئی صبح کی آس، مدھم سی آس دلوں میں اُتری۔ جینے کی آس جاگی لیکن۔

اوندھی ہنڈیا خنک توے کے پاس

(۱۔۲۔۴۴۹۱)

اوندھی ہنڈیا، خنک توا، موت کا استعارہ ہے۔ نظم کا آغاز زندگی کی جلتی آگ سے ہوا تھا۔ انجام تک آتے آتے آگ بجھی۔ خنک توے کے پاس، زندگی کی ہنڈیا اوندھی پڑی ہے۔

مجید امجد نے اپنی شاعری میں مفلوک الحال طبقے کی بات کی ہے۔ مجید امجد نے غیر طبقاتی معاشرے کا خواب دیکھا تھا۔[۴] جب کہ یہ خواب حقیقت نہیں بن سکتا تھا۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

"مجید امجد کی شاعری کی اگر کوئی تصویر بنائی جائے تو وہ یقیناً نچلے طبقے کے ایک نوجوان کی ہو گی۔۔۔

مجید امجد کا میر داستان وہ نوجوان ہے جس کے ساتھ دنیا ہر قدم پر موجود ہے۔"(۵)

مجید امجد کی شاعری زندگی کے حقائق کے قریب ہے۔ اس دنیا کی بے ثباتی کو نوحہ بیان کرتے ہوئے رنجیدہ اور دل گیر ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ جھونپڑیوں میں زندگی کی تلخیوں اور اذیتوں کو سہتے ہوئے زندہ رہنے کی دھن میں سسک رہے ہیں اور معاشرے کی بے حسّی کا شکار ہیں، مجید امجد نے ان کے دھڑکتے دلوں کی آواز سنی ہے۔ ان کی شاعری میں درد مندی کا جذبہ پوری گہرائی کے ساتھ اُبھرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سعادت سعید، "جو غم ان کے تجربات کا حصّہ بنے ہیں وہ انھوں نے قارئین تک بھی پہنچائے ہیں۔ دکھی زمانے کی راکھ میں پوشیدہ چنگاریاں اُن کی نظموں میں نئے طور کی حرارتیں بھرتی جا رہی ہیں۔"(۶)

مجموعی طور پر نظم میں بیان کی پختگی، تمثال کاری کی ندرت اور زاویہء نگاہ کی انفرادیت اور نئی علامتوں کی تلاش موجود ہے۔ نظم "سب کچھ ریت۔۔۔" میں وجود اور عدم وجود ملاحظہ کیجیے:

سب کچھ ریت۔۔۔۔ سرکتی ریت

ریت کہ جس کی ابھی ابھی قائم اور ابھی ابھی مسمار تہیں۔۔۔۔ تقدیروں کے

پلٹاوے میں

جل تھل۔۔۔ اتھل پتھل سب۔۔۔ جیسے ریت کی سطحوں پر کچھ مٹتی سلوٹیں

کیسی ہے یہ بھوری اور بھسمنت اور بھربھری ریت

جس کے ذرا ذرا سے ہر ذرّے میں پہاڑوں کا دل ہے

ابھی ابھی ان ذرّوں میں اک دھڑکن تڑپی تھی

ابھی ابھی اک سلطنت ڈوبی ہے

ابھی ابھی ریتوں کی سلوٹوں کا اک کنگرہ ٹوٹا ہے

سب کچھ ریت۔۔۔ سرکتی ریت!

(۱۳۔۲۱۔۱۷۹۱)

مجید امجد کی آزاد نظم کے اکثر مصرعوں میں نثر جیسی روانی محسوس ہوتی ہے۔ مذکورہ نظم کے مصرعوں میں بھی ایسا ہی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ یہ نظمیں نثری ہیں۔ مجید امجد کی آزاد نظمیں بحر سے آزاد نہیں ہے۔ نثر کے قریب ہونے کے باوجود اِن میں شعری آہنگ بھی موجود ہے۔ ان نظموں میں آہنگ کی روانی ہے۔ آہنگ کی اس روانی کو بعض اوقات مضمون کی تفہیم کی راہ میں حائل سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نظم کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے تو یہ روانی مضمون اور آہنگ کو ایک ساتھ منکشف کرتی ہے۔ مجید امجد کی بہت سی نظموں میں فارسی الفاظ اور تراکیب کے بجائے ہندی الفاظ نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں ہندی چھند کے قریب محسوس ہوتی ہیں۔ جس میں آہنگ کا حساب ماتراؤں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔

"سب کچھ ریت۔۔۔" میں خاص لفظوں اور اصوات کی تکرار سے صوتی تاثر پیدا کیا گیا ہے، مثلاً: "سب کچھ ریت، سرکتی ریت، ابھی ابھی، ذرا ذرا۔" مجید امجد الفاظ کی تکرار سے ایک خاص صوتی تاثر پر ہی اصرار نہیں کرتے محسوس ہوتے بلکہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ سادہ اور روزمرہ زبان بھی شاعرانہ اثر رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ الفاظ سازی کی سطح پر مجید امجد کا تجربہ یہاں بھی نظر آتا ہے۔ "پلٹاؤ" کے بجائے اس نظم میں "پلٹاوے" کا لفظ آیا ہے۔

مجید امجد کی مذکورہ نظم کے آخر میں درج تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نظم کے پسِ منظر میں سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ موجود ہے۔ زندگی کے لمحات انسان کے ہاتھ سے ریت کی طرح پھسلتے جاتے ہیں اور انسان کو اس کا احساس بھی نہیں ہو پاتا۔ مجید امجد نے یہاں سرکنے کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی جگہ سے ہٹ جانا۔ سب کچھ ریت کی طرح ہے۔ ریت کی خاصیت ہے کہ اس میں پائیداری نہیں ہوتی۔ ریت کے گھروندے آسانی سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ریت میں استحکام نہیں ہے۔ اس لیے شاعر نے آغاز ہی بے ثباتی کی بات سے کیا ہے کہ سب کچھ ریت ہے۔ جو ٹھہرتی نہیں ہے۔ ہر لمحہ سرکتی جاتی ہے۔ اگلے ہی مصرعے میں واضح ہو جاتا ہے کہ پس منظر میں کسی تباہی کا قصّہ موجود ہے۔ ریت کی قائم اور مسمار تہیں۔ یہ تقدیر کا پلٹاوا ہے۔ جب کوئی چیز پلٹی جاتی ہے تو اُلٹ پلٹ ہوتی ہے۔ جس میں کوئی چیز بھی اپنی اصل جگہ پر نہیں رہتی۔ سب کچھ

اُتھل پُتھل ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ریت کی سطح پر سلوٹیں بھی مٹتی جا رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی ریت سے عمارت بنائی گئی اور فوراً ہی مسمار ہوئی۔ اِدھر تقدیر نے قائم کیا اور اُدھر گرایا۔

مشرقی پاکستان، قیامِ پاکستان کے صرف چوبیس سال بعد ہی جدا ہو گیا۔ حساس دل رکھنے والے طبقے نے یہی محسوس کیا گویا ابھی عمارت بنی اور ابھی گرا دی گئی۔ تیز ہوا سے ریت پر بننے والی سلوٹیں جیسے مٹتی جا رہی ہیں۔ یہ ریت کیسی ہے۔ بھسم ہوئی ریت ہے۔ اسی واسطے اس کا رنگ بھورا ہے۔ بھربھری ہے۔ ریت بھربھری ہی ہوا کرتی ہے لیکن شاعر نے یہاں ریت کی اس خاصیت کی شاعرانہ توجیہہ یہ بیان کی ہے کہ مسمار ہونے کے باعث بھربھری ہے۔ بھسم ہونے کی وجہ سے بھربھری ہے۔

ریت چوں کہ پتھروں، پہاڑوں کے وجود کا حصّہ ہوتی ہے اس لیے ریت کے معمولی ذرّوں میں مجید امجد کو پہاڑوں کا دل دکھائی دیتا ہے۔ پہاڑوں سے جدا ہو جانے کی وجہ سے اس میں تڑپ ہے۔ اس کی دھڑکن تڑپتی ہے۔ سلطنت کی عمارت جس پتھر سے بنی تھی وہ ریت ہو گیا۔ اس لیے ریت کے ذرّوں میں دھڑکن تڑپ ہے کیوں کہ ایک سلطنت ڈوبی ہے، کیوں کہ پشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ ریت، بھاری ہونے کی وجہ سے پانی میں ڈوب جایا کرتی ہے اور ریتوں کی سلوٹوں سے بنی دیوار ٹوٹ گئی ہے۔ سب کچھ ریت بن چکا ہے۔ جو سرکتی جاتی ہے یعنی سب کچھ بے معنی ہے۔ زندگی ریت کی مانند ہے، ہر لمحہ اپنی جگہ سے سرک رہی ہے۔

نظم میں شاعر کے اندر کا کرب دکھائی دیتا ہے۔ ریت سے متعلق تلازمات کا ایک سلسلہ ہے۔ وجود کی بے ثباتی کے لیے ریت کا استعارہ خوب صورتی سے استعمال ہوا ہے۔ سب کچھ ریت۔۔۔ سرکتی ریت، میں معنویت کا گہرا پھیلاؤ ہے۔ جس میں زندگی سے جڑی ہر چیز شامل ہوتی ہوئی دیکھی جا سکتی ہے۔ وقت، زندگی، انسان کی ذات، انسان کا وجود، خواب، خواب کی تعبیر، جستجو، کوشش غرضیکہ سب کچھ نا پائیدار، غیر مستحکم ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سعادت سعید، راشد اور ثقافتی مغائرت، لاہور: شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، ۲۰۱۰، ص، ۸

۲۔ امجد اسلام امجد، کلیاتِ مجید امجد، مرتب: خواجہ محمد زکریا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، مجید امجد صدی ایڈیشن، ۲۰۱۴ء بیک فلیپ

۳۔ احمد ندیم قاسمی، اک شر ریر اہن خاشاک میں لپٹا ہوا، مشمولہ، قند، مجید امجد نمبر، شمارہ: ۸، ص: ۵۵

۴۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، واقعیت کا امکان، مجید امجد کی نظمیں، ایضاً، ص: ۸۹

۵۔ محمد حسن، ڈاکٹر، دو جدید نظم گو، مشمولہ، سوغات، جدید نظم نمبر، بنگلور: ۲۰۱ء، ص، ۲۹۹

۶۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، مجید امجد کی شاعری کے بارے میں چند کلمات، مشمولہ، (نمودِ حرف) مجید امجد صدی نمبر، لاہور: شمارہ: ۶، ص، ۳۱